شذرات

برطانیہ کی مشہور علمی انجمن "رائل انسٹی ٹیوٹ آف انٹرنیشنل افیئرز لندن" میں ۱۸؍ نومبر کو صدر مملکت نے تقریر کرتے ہوئے اور بہت سی اہم باتوں کے ساتھ یہ کہا۔ "معاشی اور معاشرتی دائروں میں ہماری کوششوں کا آخری مقصد یہ ہے کہ ہم پاکستان میں اسلامی سوشلزم کے حصول کی طرف پوری محنت سے قدم بڑھائیں۔" "اسلامی سوشلزم" کی اصطلاح قریب قریب "فلاحی مملکت" کے مرادف ہے۔ فلاح وبہبود کے جانے بوجھے مقاصد کے علاوہ اسلامی سوشلزم اس امر کا بھی مقتضی ہے کہ ملک کا ثقافتی و مذہبی ورثہ بھی محفوظ رکھا جائے اور معاشی ترقی کی طلب میں اسے ضائع نہ ہونے دیا جائے۔ چنانچہ اسلامی سوشلزم کا تصور "فلاحی مملکت" سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ اور وہ جامع ہے انفرادی و قومی زندگی کے ان تمام پہلوؤں پر جو چند مخصوص روحانی اور اخلاقی قدروں کا تقاضا کرتے ہیں۔

اسلام کی روحانی اور اخلاقی قدروں کو قائم و دائم رکھتے ہوئے معاشی اور معاشرتی زندگی میں زیادہ سے زیادہ ترقی کرنا، صدر مملکت کے الفاظ میں یہ ہے آج پاکستان کا مقصد جس کے حصول کی ہمیں جدوجہد کرنی ہے۔

بظاہر تو یہ بات آسان نظر آتی ہے، لیکن اسے عمل میں لانا بڑا مشکل ہے۔ کیونکہ ایک تو پچھلے دو سو سال سے مغرب بہت ترقی کر گیا ہے اور اس ترقی کے دوران اس کا کم و بیش تمام اسلامی ملکوں پر غلبہ رہا۔ اور اس کی وجہ سے ہمارے وہ طبقے جن کا آج ہمارے ہاں بڑا اثر ہے بہت حد تک اس کے رنگ میں رنگے گئے۔ دوسرے ہم مادی اور علمی لحاظ سے مغرب سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں، اور بہت سے امور میں ہم اس کے محتاج ہیں، لیکن سیاسی آزادی کے بعد اور اس وقت پورے مشرق میں جو بیداری کی لہر اٹھ رہی ہے اس کے نتیجے میں ہمارے ذہن جو مغرب سے مرعوب تھے، وہ مرعوبیت اب ختم ہو رہی ہے اور ہم اس قابل ہو گئے ہیں کہ خود اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر ادھر ادھر دیکھیں، اپنی قوتوں کا جائزہ لیں اور گرد وپیش کو سمجھیں اور اپنی راہ خود تلاش کریں۔ جہاں تک معاشی ترقی کا سوال ہے وہ ہمارے لئے بے حد ضروری ہے، بلکہ اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ کیونکہ اگر ہم زراعت کو ترقی نہیں دیتے تو ہمارے لئے اپنی بڑھتی ہوئی آبادی کے مطابق اناج پیدا کرنا ناممکن ہوگا۔ اسی طرح صنعتوں کی ترویج کے بغیر ہماری غریبی و محتاجی

بھی کبھی دور نہیں ہوگی۔ اب ان چیزوں کے لئے لامحالہ عام تعلیم اور خاص کر ٹیکنیکل اور سائنسی تعلیم کو زیادہ سے زیادہ رائج کرنا ہوگا۔ اور جب یہ رائج ہوگی تو اس کے اثرات لازماً ہمارے معاشرے پر پڑیں گے۔ لوگوں کے سوچنے کے انداز بدلیں گے، ان کے رہن سہن کے طریقے بدلیں گے، ان کی ضرورتیں اور ہوں گی، اور وہ ان ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے انہیں تگ و دو کرنا پڑے گی۔ یہ صورتحال پہلے معاشرے کو بدلے گی۔ اور لوگوں کو اپنے آپ کو نئے معاشرے کے قالب میں ڈھالنا ہوگا۔ یہ سب کچھ ہو کر رہے گا۔ اس کے سوا ہمیں مفر نہیں۔ ہر معاشرہ کو ان مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔

[illegible] ترقی [illegible] والی معاشرتی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ ہمیں اپنے مذہبی و ثقافتی ورثے کو بھی باقی رکھنا ہے اور اُسے اس قابل بنانا ہے کہ وہ ہمیں روحانی اور اخلاقی قدریں دے، جو نہ صرف ہمارے باطن کو منور کریں بلکہ انہیں ہم شمعِ ہدایت بنا کر زندگی کی راہوں پر آگے قدم بڑھا سکیں۔ روحانی اور اخلاقی قدریں مشینوں اور سائنس اور ٹیکنیکل تعلیم کی طرح باہر سے درآمد نہیں ہوا کرتیں۔ اس کے سرچشمے قوم کے بطن سے، اس کی تاریخ سے اور اس کے مذہبی و ثقافتی ورثے سے پھوٹتے ہیں۔ اور خدا کے فضل سے ہمارے ہاں اس سرمائے کی کمی نہیں۔ بلکہ واقعہ تو یوں ہے کہ دنیا کی کسی قوم اور ملت میں اس قدر فراواں نہ ہوگا۔ ضرورت اسے صحیح طرح بکارآمد بنانے کی ہے اور اسے آج کی زبان، آج کے اندازِ فکر اور آج کے طریقوں کے مطابق پیش کرنے کی ہے تاکہ وہ ہمارے عوام کی زندگی میں رَچ سکے اور خواص اسے اپنا کر اس میں نئی جِلا پیدا کریں۔

یوں تو ہماری پوری تاریخ ایسے ائمہ مجددین، مجتہدین، علماء، صوفیاء اور اہلِ فکر سے بھری پڑی ہے جنہوں نے اپنے اپنے دور میں قرآن، سنت اور اسلام کے پیغام کو اُس دور کے حالات و مقتضیات کے مطابق اور اپنے ملک اور مخاطبین کی عملی ضرورتوں اور ذہنی استعدادوں کا خیال رکھ کر پیش کیا، اور لوگوں نے اسے سنا، مانا اور اس پر عمل کیا، اور اس طرح ان تیرہ صدیوں میں ملت کا کارواں آگے بڑھتا رہا، یہ سب بزرگ اور ان کے کارنامے ہمارا مذہبی و ثقافتی ورثہ ہیں اور ان کے سرمایۂ علم و معرفت سے ہم ہمیشہ استفادہ کرتے رہیں گے، لیکن جہاں تک اس برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کا تعلق ہے۔ ان کے لئے آج سے دو سو سال قبل ایک بزرگ ایسا مذہبی و ثقافتی ورثہ مدوّن کر کے چھوڑ گئے ہیں کہ اگر ہم اسے اپنا فکری اساس بنائیں اور بعد میں اس اساس سے جس طرح مختلف بزرگوں نے مختلف حالات میں

استفادہ کر کے اس مذہبی و ثقافتی ورثے سے کام لیا، اسے بھی پیش نظر رکھیں تو معاشی ترقی اور معاشرتی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ جن اخلاقی اور روحانی قدروں کی ہمیں آج ضرورت ہے، اُن کی تشکیل و ترتیب میں ہمیں اس بزرگ کی تصنیفوں اور افکار و تعلیمات سے بڑی مدد مل سکتی ہے۔ یہ بزرگ حضرت شاہ ولی اللہ تھے، جن کے علمی وارث اگر ایک حد تک علمائے دیوبند ہیں، تو اتنے ہی علمائے اہلِ حدیث بھی ہیں۔ پھر ان سے سرسید، شبلی، ابوالکلام اور اقبال تک نے بھی فیض حاصل کیا، اور اس طرح فکر ولی اللّٰہی کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔

یقیناً ہمارے ہاں معاشی ترقی کی ذہنی معیار سائنسی اور ٹیکنیکل تعلیم ہے اور آخر الذکر کے بغیر معاشی ترقی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، اس طرح ہمارے خیال میں اگر مذہبی و ثقافتی ورثے کو اس سرزمین میں ایک قابل لحاظ اور مرجعِ فکر و عمل بنانا ہے تو اس کے سوا اور کوئی صورت نہیں کہ ہم تعلیمات و علوم ولی اللّٰہی کو اپنا اساس بنائیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ نے بہت حد تک اگلوں اور پچھلوں کے علوم اپنی تصنیفات میں جمع کر دیئے ہیں، اور وہ اگر ایک لحاظ سے قدامت کے جامع ہیں، تو دوسرے لحاظ سے ایک نئی علمی و فکری زندگی کا نقطۂ آغاز بھی ہیں۔

یہ زمانہ آنکھیں بند کر کے پہلوں کی ہر بات اور اُن کی ہر تعبیر کو ماننے کا نہیں۔ ہمیں شاہ ولی اللہ صاحب کے علوم و افکار کا تنقیدی مطالعہ کرنا ہوگا، اور اُن میں اگر ایسی چیزیں ہیں جنہیں اس زمانے میں عمل عقل اور مشاہدہ و تجربہ صحیح ماننے کو تیار نہیں، تو اُس سے لامحالہ درگزر کرنا ہوگا۔ حضرت شاہ صاحب نے بہت سی باتیں اپنے زمانے کے مزعومات کے مطابق فرمائیں، جن کے ظاہر ہے وہ معنی نہیں لئے جا سکتے، جو شاہ صاحب نے اُس وقت لئے تھے۔ لیکن قرآن مجید کی تفسیر، سنت و حدیث کی اہمیت، فقہ کے ارتقاء اور تصوف و کلام کے بارے میں شاہ صاحب کے افکار میں ہمارے لئے اتنا کچھ ہے کہ ہم اسے حقیقی طور پر اپنا فکری، ثقافتی اور مذہبی ورثہ بنا سکتے ہیں۔ یہ ورثہ محض بے جان اور بے روح روایات کا پلندا نہیں، اس میں فکر کو متحرک کرنے کی بڑی صلاحیتیں ہیں اور ہمیں ان سے کام لینا چاہئے۔